ریل کے بچّے
احمد خاں خلیل

ریل کے بچّے

ترجمہ : احمد خاں خلیل

ایڈتھ نسبِٹ

کی کہانی "دی ریل وے چلڈرن" کا ترجمہ

نونہال ادب

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس کراچی

کیا تھا کیا ہو گیا

اُن کا نام "ریل کے بچّے" بعد میں پڑا۔ پہلے یہ اپنے باپ اور ماں کے ساتھ لندن کے قریب ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ یہ بنگلہ سُرخ اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ اُس کے صدر دروازے میں رنگ دار شیشہ لگا ہوا تھا۔ گھر کے اندر کے تمام دروازوں، کھڑکیوں اور الماریوں پر سفید روغن کیا ہوا تھا۔ گھر میں پانی، بجلی اور دوسری تمام ضروری سہولتیں موجود تھیں۔ اُنھوں نے

صرف ایک بار اُس وقت ریل کا سفر کیا تھا جب وہ مادام تساد کا عجائب گھر دیکھنے گئے۔ اس عجائب گھر میں دُنیا کے بڑے آدمیوں کے موم کے مجسّمے موجود ہیں۔ یہ مجسّمے اِس مہارت سے بنائے گئے ہیں کہ سچ مُچ کے زندہ آدمی لگتے ہیں۔

یہ کل تین بچے تھے۔ رابرٹا سب سے بڑی تھی اور ماں کی بڑی چہیتی تھی۔ اُس سے چھوٹا پیٹر تھا۔ اُسے انجینیئر بننے کا شوق تھا۔ فیلس سب سے چھوٹی تھی، اِس لیے یہ سب کو پیاری تھی۔

اُن کی امّی بڑی اچھّی تھیں۔ کتابوں سے مزے دار کہانیاں چُن کر اُنہیں سُناتی تھیں۔ اسکول کے ہوم ورک میں اُن کی مدد کرتی تھیں۔ اُن میں سے جب کسی کی سال گرہ کا دِن آتا تو وہ ایک خوب صورت نظم سُنا کر سب کا دِل خوش کر دیتی تھیں۔ اُن کے ابّو بھی شریف انسان تھے۔ نہ اُن کی

تیوری میں کبھی بل پڑے اور نہ وہ کبھی غصّے ہوئے۔ تینوں بچّوں سے برابر کا سلوک کرتے اور ہنسی خوشی کی بات میں بچّوں کے ساتھ ہنس بول لیتے تھے۔

گھر کا ماحول بڑا اچھّا تھا۔ تینوں بچّے خُوش و خُرّم رہتے تھے۔ وقت بہت اچھّا گُزر رہا تھا، لیکن ایک دِن ایسا واقعہ ہوا جس سے اُن کی خوشیاں چھِن گئیں، گھر بھر پر اداسی چھا گئی۔ اُسی دِن جب اُن کے ابّو پیٹر کا ریلوے انجن کا کھلونا ٹھیک کر رہے تھے تو دو آدمی آئے۔ وہ اُن کے ابّو سے ملے۔ پھر ایک ٹیکسی بُلوائی گئی اور اُن کے ابّو اُن کے ساتھ کہیں چلے گئے۔ اُن کی امّی کا مُنہ فق ہو گیا۔ وہ سخت پریشان نظر آ رہی تھیں۔ بچّے بھی پریشان ہو گئے۔ ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو گیا۔

بچّوں نے امّی سے پوچھا تو وہ کہنے لگیں۔

"اچھے بچّے بے کار سوال نہیں پوچھا کرتے۔"

بچّے چُپ ہو گئے۔ اُنہیں کُچھ معلوم نہ تھا کہ کیا ہوا۔ رابرٹا سب سے بڑی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ضرور کوئی خاص بات ہے جس نے امّی کو اتنا پریشان کر دیا ہے۔ فیلس جو سب سے چھوٹی تھی وہ بھی اِس تبدیلی کو دیکھ رہی تھی۔ پہلے جب بچّے مہم جوئی کی کہانیاں پڑھتے تھے تو اُن کے دِل میں بھی یہ خواہش کروٹیں بدلتی تھی کہ اُنہیں بھی کوئی مشکل پیش آئے اور وہ اُسے اپنی عقل اور دلیری سے حل کریں۔ لیکن آج ایک تو اُنہیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ ہوا کیا ہے۔ دوسرے سارے گھر پر غم کا بادل سا چھا گیا۔ مہم جوئی، غم جوئی میں بدل گئی۔

چند ہفتوں تک ہر بات پریشان کرنے والی اور دِل دُکھانے والی تھی۔ بچّوں کو بتایا گیا کہ تمہارے ابّو کسی سرکاری کام سے کہیں دُور گئے ہیں،

کُچھ مدّت کے بعد واپس آ جائیں گے۔ امّی نے کہا۔ "دیکھو گھبراؤ مت۔ آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

پھر اُنہیں بتایا گیا کہ ہم یہ گھر چھوڑ رہے ہیں۔ یہاں سے دور دیہات میں ایک چھوٹا سا گھر لے لیا ہے۔ وہاں جا کر رہیں گے۔ گھر کا تمام سامان باندھ دیا گیا۔ رابرٹا کہنے لگی: "امّی، ہم سارا کباڑ کہاں لے جا رہے ہیں۔"

اُس کی امّی نے جواب دیا: "نہیں بیٹا، ہم استعمال کی چیزیں لے جائیں گے۔ ہمیں ثابت کرنا ہے کہ ہم غریبی کی زندگی بھی ہمّت سے گزار سکتے ہیں۔"

گھر کا تمام سامان ایک گاڑی میں لاد دیا گیا۔ پھر ایک ٹیکسی منگوائی گئی، جس نے بچّوں کو ریلوے اسٹیشن پہنچایا۔ ریل گاڑی آئی تو وہ اُس پر سوار ہو گئے۔ سفر بڑا لمبا تھا۔ بچّے ٹرین میں بیٹھے بیٹھے سو گئے۔ جب وہ جگہ آئی

جہاں اُن کو اُترنا تھا تو اُن کی ماں نے ان کو جگایا۔

گاڑی سے اتر کر وہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی چلی۔ آخر میں گارڈ کا ڈبّا تھا۔ جب وہ اُن کے سامنے سے گُزرا تو اُنھوں نے دیکھا کہ اس کی پچھلی بتّیاں روشن تھیں۔ چھک چھک کرتی گاڑی دُور سے دُور تر ہوتی جا رہی تھی اور وہ بتّیاں مدھم سے مدھم تر ہوتی جا رہی تھیں یہاں تک کہ گاڑی اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اُس وقت اُن بچّوں کو معلوم نہ تھا کہ ایک دِن ریل کا اُن کی زندگی میں اتنا دخل ہو گا کہ ریل ہی اُن کی پہچان بن جائے گی۔

اسٹیشن سے اُن کے نئے گھر کا راستہ لمبا اور کچّا تھا۔ یہ فاصلہ طے کرنے میں اُنھیں بہت وقت لگا۔ فیلس کے جوتوں کے تسمے بار بار کھُل جاتے تھے۔ راستے میں کئی بار وہ تسمے باندھنے کے لیے رُکی۔ اس سے پہلے بچّے کبھی اتنا

زیادہ نہیں چلے تھے، اِس لیے گھبرا گئے۔

بچّوں کا نیا گھر۔ تین چمنیاں

اللہ اللہ کر کے راستہ ختم ہوا۔ ایک گیٹ آیا۔ اُس گیٹ سے کُچھ فاصلے پر ایک دُھندلی سی عمارت نظر آئی۔ اُن کی امّی نے اُنھیں بتایا کہ یہی وہ مکان

ہے.جس میں ہم رہیں گے۔ اُس کا نام ہے "تین چمنیاں۔"

اُس میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ دروازے پر قُفل لگا ہوا تھا۔ ایک ریڑھے والا اُن کا سامان لایا تھا۔ اُسے دروازے کے پاس رکھی ہوئی کُنجی مل گئی۔ اُس نے دروازہ کھولااور باورچی خانے کی میز پر رکھی ہوئی موم بتّی جلائی۔ باورچی خانہ تاریک اور ڈراؤنا سا تھا۔ اُس کے کونوں میں فرنیچر کا ڈھیر لگا تھا۔ انگیٹھی میں آگ نہیں تھی۔ یہ ایک سُنسان سا مکان تھا جہاں ہُو کا عالم تھا۔ دیواروں کے پاس اُنہیں عجیب سی آواز سُنائی دی۔ بچّوں نے پوچھا۔ "یہ کیسی آواز ہے؟"

ریڑھے والے نے کہا: "کُچھ نہیں یہ چوہے دوڑ رہے ہیں۔"

پھر ریڑھے والا بھی چلا گیا۔ دروازہ بند ہوا تو ہوا کے جھونکے سے موم بتّی بُجھ گئی۔ فیلس نے بہت صبر کیا، مگر اُس سے رہا نہ گیا۔ بڑی حسرت سے

کہنے لگی۔ ”کاش ہم یہاں نہ آئے ہوتے۔“ اور پھر اُس کے کانوں میں
ریڑھے والے کی آواز گونجنے لگی۔ ”کُچھ نہیں، یہ چوہے دوڑ رہے ہیں۔“

کوئلے کی کان

گھر کو دیکھ کر بچّے کُچھ حیران سے تھے۔ اُن کی امّی نے اُنہیں خاموش دیکھ کر کہا۔ "تُم مُہم جوئی کی خواہش کرتے تھے۔ یہاں کی زندگی تمہارے لیے مُہم سے کم نہیں، عقل کے گھوڑے دوڑاؤ۔"

اُن کو بتایا گیا تھا کہ رات کا کھانا کوئی پڑوسی لا دے گا مگر اُنہیں کہیں رکھا نہ ملا۔ ناچار اُنھوں نے اپنے لائے ہوئے سامان سے ایک بکس تلاش کیا

جس میں کھانے کا کُچھ سامان تھا۔ گھر کی بچی کُچھی کُچھ چیزیں مل گئیں۔ اُنھوں نے اِس سُنسان مکان کے باورچی خانے میں پکنک منالی۔

ہر شخص تھکا ہوا تھا۔ اِس عجیب و غریب کھانے نے ایک ڈھارس سی بندھا دی۔ چند نمکین اور چند میٹھے بسکٹ، ڈبّے میں بند سارڈین مچھلی، ادرک کا اچار، کشمش، نارنگیوں کے چھلکوں کا مربّہ جسے مارملیڈ کہتے ہیں۔ یہ تھا اُن کا کھانا جو اُنھوں نے مزے سے کھایا۔ پھر سب نے مل کر بستر بچھائے اور سو گئے۔ رات کو رابرٹا کی آنکھ کھُلی۔ اس کی ماں اُس وقت بھی سونے کے کمرے میں کسی کام میں مصروف تھی۔

صُبح ہوئی تو بچے چُپکے سے باورچی خانے میں جا گھسے۔ اُنھوں نے سوچ رکھا تھا کہ پہلے ہاتھ مُنہ دھولیں، مگر سونے کے کمرے میں تو پانی تھا ہی نہیں۔ باہر نکل کر دیکھا تو صحن میں ایک نلکا نظر آیا۔ بچّوں نے ہاتھ مُنہ دھویا۔

واپس باورچی خانے گئے، کسی نے آگ جلائی، کسی نے میز صاف کی اور کسی نے میز پر برتن چُن دیے۔

یہ مکان "تین چمنیاں" ایک ڈھلان پر بنا ہوا تھا۔ نیچے اُنہیں ریل کی پٹڑی اور ایک سُرنگ کا سیاہ مُنہ نظر آتا تھا۔ ریلوے اسٹیشن نظر سے اوجھل تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی کھیت ہی کھیت نظر آتے تھے۔ باہر کی دُنیا کا نظّارہ کرنے کے لیے وہ گھر سے نکلے۔ ڈھلان پر اُگی ہوئی گھاس میں ایک چوڑا ہموار پتھر پڑا تھا۔ وہ سب اُس پر بیٹھ کر ریل کا انتظار کرنے لگے۔

آٹھ بجے اُن کی امّی اُنہیں تلاش کرتے کرتے وہاں پہنچیں تو دیکھا کہ وہ سب سو رہے تھے۔ اُنھوں نے گھر میں جو آگ جلائی تھی وہ بُجھ چکی تھی۔ کیتلی کا پانی اُبل اُبل کر ختم ہو چکا تھا۔ کیتلی کا پیندا جل چُکا تھا۔ اُن کی امّی گھر سے باہر دیکھنے گئیں تو ایک جگہ رات کا کھانا رکھا تھا۔ اُنھوں نے اُسے

ناشتے کے طور پر کھا لیا۔ بھُنا ہوا گوشت، ڈبل روٹی، مکھن، پنیر اور سموسے۔ ہر چیز بڑی اچھی لگی۔

کھانا کھا کر گھر کا سامان کھولا گیا اور ہر چیز کو اپنی اپنی جگہ رکھا گیا۔ پھر اُن کی امّی لیٹ گئیں اور تینوں بچّے ریل کی پٹڑی دیکھنے کے لیے گھر سے نکلے۔ اُن کے گھر کے سامنے ڈھلان پر گھاس اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اِدھر اُدھر پیلے رنگ کی چٹّانیں تھیں۔ ڈھلان سے اُترتے ہی ایک لکڑی کا جنگلا تھا۔ اُس کے آگے ریل کی پٹڑی تھی۔ پٹڑی سے کُچھ فاصلے پر ٹیلی گراف کے کھمبے اور سگنل لگے ہوئے تھے۔

اچانک کھڑکھڑاہٹ سی سُنائی دی۔ سُرنگ سے شور مچاتی ہوا ایک ریل نکلی اور سن سے اُن کے پاس سے گُزر گئی۔ رابرٹا نے کہا۔

"دیکھا تُم نے، ایک بڑے اژدھے کی طرح دندناتی گزری ہے۔"

پیٹر نے عقل کی بات کی۔ "ہمیں پٹڑی کے اتنے قریب نہیں آنا چاہیے۔"

رابرٹا کو گھر میں پیار سے بوبی کہتے تھے۔

بوبی بولی: "میرا خیال ہے یہ گاڑی لندن گئی ہے۔ ہمارے ابّو بھی لندن میں ہیں۔"

پیٹر نے کہا۔ "چلو بھئی اسٹیشن سے معلوم کریں۔"

وہ ریل کی پٹڑی کے نیچے بچھے ہوئے سلیپروں پر پاؤں رکھ کر چلنے لگے۔ چلتے چلتے وہ اسٹیشن پہنچ گئے۔ ایک کمرے میں جھانک کر دیکھا تو قُلی ایک اخبار سامنے رکھے ہوئے اونگھ رہا تھا۔ اسٹیشن پر کئی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ دیوار کی طرح اونچا ایک بڑا ڈھیر لگا تھا جس میں کوئلے کے

چوکور ٹکڑے اینٹوں کی طرح بے ترتیب سے جمائے ہوئے رکھے تھے۔ اوپر والے ردّے پر چونے سے ایک لکیر لگائی گئی تھی۔ اسٹیشن پر ایک گھنٹا لٹک رہا تھا۔ کسی نے اُسے دو بار بجایا تو قُلی باہر نکلا۔ پھر وہ گھومتا ہوا اُن بچّوں کے پاس آگیا۔ بچّے اِس بات پر حیران تھے کہ کوئلے کے ٹکڑوں پر سفید لکیر کیوں لگی ہے۔ قُلی نے اُنہیں بتایا کہ اِس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئلے کے ٹکڑے اپنی ٹھیک جگہ پر جمے ہوئے ہیں اور کسی نے اُنہیں نہیں چھیڑا۔

بچّے جلد ہی اپنی نئی زندگی کے عادی ہو گئے۔ اگرچہ اُن کے پاس دِل چسپی کی کوئی خاص چیز نہ تھی، لیکن جو کُچھ تھا وہ اُس میں دل چسپی لینے لگے۔ پاس ہی ایک نہر تھی۔ اُس میں سامان سے لدی ہوئی کشتیاں تھیں جن کو گھوڑے کھینچتے تھے۔ گھوڑے کنارے کنارے چلتے تھے اور کشتیاں پانی

میں رسّیوں کے ذریعہ سے کھینچی چلی جاتی تھیں۔ اُن کے گھر کے چاروں طرف زیادہ تر کھیت اور جھاڑیاں تھیں۔

پُرانی باتیں اب اُن کو خواب لگتی تھیں۔ اگرچہ وہ اپنے ابّا جان کو بھولے نہیں تھے، لیکن اُن کے بغیر زندگی گزارنے کے عادی ہو گئے۔ اب اُن کی امّی اپنا فارغ وقت کہانیاں لکھنے میں گزارتی تھیں۔ اُن کی کسی نہ کسی کہانی کا معاوضہ مل جاتا تھا۔ اُس سے بچّوں کے لیے کشمش والے بند خرید لیے جاتے تھے۔

اُن کی امّی اکثر اُن سے کہتی رہتی تھیں کہ دیکھو بچّو اب ہم غریب ہیں، لیکن ہمیں ہمّت نہیں ہارنی چاہیے۔ ایک دِن سخت سردی پڑی۔ بچّوں نے کہا۔ "امّی آگ کے بغیر گزارا نہیں ہو گا۔" اُن کی ماں نے جواب دیا۔، "کوئلا بہت مہنگا ہے۔ جاؤ اوپر کی منزل میں خوب کھیلو کودو۔ اِس سے تمہارا بدن

گرم ہو جائے گا۔"

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ پیٹر کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ بہنوں نے پوچھا۔ "تمھیں کیا خیال سوجھا ہے؟"

پیٹر بولا: "میں یہ نہیں بتاؤں گا۔ میری مہم ایک راز ہے، لیکن تُم امّی سے کُچھ نہ کہنا، اگر وہ زور دے کر پوچھیں تو کہنا پیٹر کان کُنی کا کھیل کھیل رہا ہے۔"

فیلس نے پوچھا: "کس چیز کی کان؟"

"کوئلے کی کان۔" پیٹر نے جواب دیا۔

گھر میں ایک پرانی بچّہ گاڑی رکھی تھی جس میں بچّوں کو گھُمایا پھرایا جاتا تھا۔ پیٹر نے اُسے صاف کیا۔ دھکیل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ چل سکتی ہے۔

دو دِن بعد اُس نے اپنی بہنوں سے کہا کہ اِس گاڑی کو ڈھلان سے نیچے لے جانا چاہیے۔ ہم اسے اسٹیشن لے جائیں گے۔ وہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے۔ اُس میں میں کان کنی کروں گا۔

آخر اسٹیشن ماسٹر نے پیٹر کو کوئلا لے جاتے پکڑ ہی لیا

بچّے اس گاڑی کو دھکیل کر اسٹیشن لے گئے۔ چھوٹی سی پہاڑی کے پاس پہنچ کر پیٹر اُس کے اوپر چڑھا۔ کوئلا کھود کر نکالا اور بچّہ گاڑی میں رکھ دیا۔ پھر یہ تینوں اُسے دھکیل کر گھر لائے۔ دراصل یہ پہاڑی نہیں تھی، کوئلے کا اتنا بڑا ڈھیر تھا کہ پہاڑی سی لگتی تھی۔

کُچھ دِن کان کنی یعنی کوئلا کھودنے کی مہم جاری رہی۔ پیٹر اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا۔ اُس کی بہنوں کو بھی اِس بات پر فخر تھا کہ وہ مہم جوئی میں حصّہ لے رہی ہیں، لیکن اسٹیشن ماسٹر صاحب تاک میں تھے۔ ایک دِن پیٹر وہاں ڈھیر کو کھود رہا تھا کہ اسٹیشن ماسٹر نے پکڑ لیا۔ اُنھوں نے کہا۔

"اچھّا تو تُم کوئلا چُراتے ہو؟"

"جناب میں چور نہیں ہوں۔ میں کان کن ہوں۔ میں ایک مہم جو ہوں۔" پیٹر نے جواب دیا۔

اتنے میں بوبی اور فیلس ٹرک کے پیچھے سے نکل آئیں۔ اسٹیشن ماسٹر نے اُنھیں دیکھ کر کہا: "یہ بہت بُری بات ہے، بتاؤ تُم نے ایسا کیوں کیا؟"

"اچھّا تو پورا ٹولا ہے۔ تین چمنیوں والوں کا، کیا تمھیں معلوم نہیں کہ یہ چوری ہے؟"

پیٹر نے اسٹیشن ماسٹر کو بتایا کہ اُن کی امّی کہتی ہیں کہ ہم بہت غریب ہیں۔ ہم اتنا خرچ نہیں کر سکتے، اِس لیے میں نے سوچا کہ کان کو کھود کر کوئلا نکالنا چاہیے۔ یہ مہم جوئی بھی ہے اور محنت بھی۔

اسٹیشن ماسٹر صاحب نے کہا: "دیکھو جی، چوری چوری ہے خواہ وہ مہم جوئی کے بہانے کی جائے یا کسی اور بہانے سے۔ خیر یہ تمھاری پہلی غَلَطی ہے، اِس لیے میں تمھیں چھوڑتا ہوں۔ پھر کبھی ایسا نہ کرنا۔" بچّوں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور گھر کی راہ لی۔

پیٹر نے کہا: "دیکھو امّی کو نہ بتانا۔"

نیک دِل بوڑھا

اس علاقے میں کوئی چیز نہ تھی جس سے بچّے دِل بہلاتے۔ اُن کے گھر کے پاس لے دے کر ایک ریل کی پٹڑی تھی اس پر سے گاڑیاں گزرتی تھیں۔ صُبح و شام اُن کا اِس پٹڑی اور گاڑیوں سے واسطہ تھا۔ تینوں بچّے ذہین تھے۔ اُنھیں کئی باتیں سوجھتی تھیں۔ اُنھیں اِن گاڑیوں کے بارے میں کوئی معلومات نہ تھیں۔ وہ صرف یہ جانتے تھے کہ سوا نو بجے ایک ٹرین

اِدھر سے اُدھر کو جاتی ہے۔ آدھی رات کو ایک ایکسپریس ٹرین گزرتی ہے۔ اُنھوں نے اِن ریل گاڑیوں کو اپنے نام دے رکھے تھے۔ وہ سوا نو بجے والی گاڑی کو "سبز اژدھا" اور رات کی ایکسپریس کو "کالی مکّھی" کہتے تھے۔

جب ریل آنے والی ہوتی تو وہ گھر سے نکل کر پٹڑی کے پاس جنگلے کے قریب کھڑے ہو جاتے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ سوا نو بجے کی ٹرین لندن جاتی ہے جہاں اُن کے ابّو رہتے ہیں۔ جب وہ آتی تو وہ اپنے پرانے رومال ہلا ہلا کر اس کو سلام کرتے اور سمجھتے کہ وہ لندن میں اُن کے ابّو کو اُن کے سلام پہنچا دے گی۔ اُس گاؤں سے ایک بُوڑھا آدمی جایا کرتا تھا۔ وہ خاص طور پر اپنا اخبار لہرا لہرا کر بچّوں کو سلام کرتا تھا اور بچّے یہ سمجھتے تھے کہ یہ اچھّا آدمی اُن کے ابّو کو جانتا ہے اور ہمارا سلام اُنھیں پہنچاتا ہے۔

ایک دِن وہ کشمش والے بند خریدنے گئے۔ وہاں اُنھوں نے اِسٹیشن ماسٹر صاحب کو بتایا کہ اُن کی امّی کہانیاں لکھتی ہیں۔ اُن کی ایک کہانی کا معاوضہ ملا ہے جس سے اُنھوں نے یہ بند خریدے ہیں۔

اسٹیشن ماسٹر نے کہا: "تُم لوگوں کی امّی بڑی قابل خاتون ہیں۔ تمھیں اِس بات پر فخر ہونا چاہیے۔ تُم لوگ جب چاہو اسٹیشن آ سکتے ہو۔" اِس سے اُنھیں اندازہ ہوا کہ کوئلے والی بات اب رفع دفع ہو گئی ہے۔

اسٹیشن کے قُلی کا نام پرکس تھا۔ اُس نے اِن بچّوں کو ریلوے کے بارے میں کئی معلومات بتائیں۔ اِسی سے اُنھیں معلوم ہوا کہ ریل گاڑی کے ڈبّوں میں ایک زنجیر لٹکی رہتی ہے۔ جب کسی کو جان کا خطرہ ہو تو زنجیر کھینچ لی جاتی ہے اور گاڑی رُک جاتی ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ ریلوے انجنوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ہر انجن کا ایک نمبر ہوتا ہے جو اُس پر لکھا ہوتا ہے۔

ایک دِن اُن کی امّی بیمار پڑ گئیں۔ پیٹر قریبی گاؤں سے ڈاکٹر کو بلانے گیا۔ ڈاکٹر صاحب آئے۔ ان کی ماں کا معائنہ کیا اور انفلوئنزا کی بیماری تشخیص کی۔ ڈاکٹر نے کہا: "دیکھو بچّو، یہ دوا اپنی امّی کو صُبح، دوپہر اور شام پلاؤ اور اِن کو اچھے اچھّے کھانے کھلاؤ جن سے جسم میں طاقت آتی ہے مثلاً چوزوں کا شوربا، انڈے، پھل وغیرہ۔"

بچّے یہ سُن کر سخت پریشان ہو گئے۔ یہ چیزیں کہاں سے آئیں گی؟ اُن کے پاس تو اتنے پیسے نہیں۔ بوبی نے کہا۔ "ہمیں کُچھ کرنا چاہیے۔ امّی جلد ٹھیک نہ ہوئیں تو کام کیسے چلے گا۔"

سب نے مل کر یہ ترکیب سوچی کہ ریل کی پٹڑی کے پاس بڑے حروف میں یہ نوٹس لگا دیا جائے کہ "ہمیں اسٹیشن پر ملیے" پھر ہم میں سے ایک بچّہ خط اسٹیشن لے جا کر اُس نیک دِل بُوڑھے آدمی کو دے جو روزانہ اخبار ہلا ہلا کر

ہمیں سلام کرتا ہے اور ہمارا سلام ہمارے ابّو کو پہنچاتا ہے۔

ایک کاغذ پر بڑے بڑے الفاظ میں نوٹس لکھ کر جنگلے میں لگا دیا گیا۔ فیلس کو ایک خط دیا گیا کہ وہ اسٹیشن لے جا کر نیک دِل بُوڑھے کو تلاش کر کے اُس کو دے دے۔ اُس میں لکھا تھا کہ ہماری امّی سخت بیمار ہیں۔ ڈاکٹر نے اُن کے لیے فلاں فلاں چیزیں تجویز کی ہیں۔ ہمارے پاس پیسے نہیں، آپ ہمیں یہ چیزیں دے دیں۔ ہم بڑے ہو جائیں گے تو آپ کو اُن کی قیمت ادا کر دیں گے۔

جب گاڑی گُزری تو اُنھوں نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کی توجّہ نوٹس کی طرف دِلائی۔ اِدھر فیلس نے اُس نیک دِل بُوڑھے کو تلاش کر کے خط پہنچایا۔ اُس نے خط پڑھا اور مُسکرا کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور اخبار پڑھنے لگا۔

اُسی شام کو قُلی پر کس ایک ٹوکری لایا۔ اُس نیک دِل بُوڑھے نے لکھا تھا کہ آپ کی مدد کر کے مُجھے سچّی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ مُجھے اُمّید ہے کہ آپ کی امّی اِس بات پر ناراض نہیں ہوں گی۔ پندرہ دِن بعد اُنھوں نے پھر ایک نوٹس لگا دیا۔ "اب امّی ٹھیک ہیں شکریہ۔"

اُن کی امّی کو پتا چلا تو وہ سخت خفا ہوئیں۔ انھوں نے ڈانٹ کر کہا: "تمھیں کبھی کسی سے کوئی چیز نہیں مانگنی چاہیے۔ ہرگز ہرگز کوئی چیز نہیں مانگنی چاہیئے۔"

پھر وہ کہنے لگیں۔ "اب جب کہ یہ سب کُچھ ہو گیا ہے تو میرا فرض ہے کہ اس شخص کا شکریہ ادا کروں۔"

بوبی کی سالگرہ

اُن کے گھر کا رواج تھا کہ وہ سال گرہ کو تیوہار کی طرح بڑے شوق سے
مناتے تھے۔ بوبی کی بارہویں سال گرہ آئی۔ اگرچہ اُن کے پاس تھے
خریدنے کے لیے رقم نہیں تھی، لیکن اُنھوں نے اپنے طور پر جو کچُھ ہو سکتا
تھا وہ کیا۔ فیلس نے اپنی باجی کے لیے ایک سوئی دانی بنائی۔ اُن کی ماں
نے اپنے بکس سے چاندی کا ایک ہئیر پِن نکالا۔ پیٹر نے کہا۔ "میں اپنا

انجن والا کھلونا باجی کو دے دوں گا۔" تینوں بچّوں نے باہر سے خوب صورت پھول اور پتیاں جمع کیں۔ کھانے کی میز کو صاف کر کے اِن پھولوں سے میز پر ریلوے اسٹیشن، سگنل اور پٹڑی کا نقشہ بنایا۔ ایک کیک بھی جس پر گلابی رنگ کی شکر سے بوبی کا نام لکھا تھا، موجود تھا۔

چائے کے وقت بوبی سے کہا گیا کہ تُم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔ ہم سب چیزوں کو قرینے سے رکھ کر تمہیں گھنٹی بجا کر بُلائیں گے۔ جب میز لگ گئی تو بوبی کو بُلایا گیا۔ گیارہ موم بتّیاں جلائی گئیں۔ اُن کی امّی نے سال گرہ پر ایک خوب صورت نظم لکھی تھی وہ سُنائی۔ بارہ اُودے پھولوں کا ایک تاج بوبی کو پہنایا گیا اور یہ سب کُچھ اتنی محبّت سے ہوا جیسے کوئی مذہبی رسم ادا کی جا رہی ہو۔

تقریب ختم ہوئی۔ بچّے کھیل کود میں لگ گئے۔ اُن کی امّی ایک میز پر کُچھ

لکھنے لگیں بوبی نے کہا۔ "پیاری امّی آپ دیر تک نہ جاگا کیجیے۔"

اُس کی امّی نے کہا: "میں تمہارے ابّا جان کو خط لکھ لوں تو سو جاؤں گی۔"

رات کو ایک بار بوبی اپنے تحفے لینے آئی تو دیکھا کہ اُس کی امّی اپنے بازوؤں پر سر رکھے میز پر بیٹھی تھیں۔ یہ دیکھ کر وہ چُپکے سے واپس چلی گئی۔ اُس نے اپنے دِل میں کہا۔ "امّی اپنا دُکھ ظاہر نہیں کرنا چاہتیں۔ وہ بہت دُکھی ہیں۔" اِس خیال سے اُس کی سال گرہ کی تمام خوشی ختم ہو گئی۔

قیدی

اُن کی امّی ریل گاڑی کے ذریعہ سے قریبی گاؤں کے ایک ڈاک خانے میں خط ڈالنے جایا کرتی تھیں۔ جب گاڑی سے وہ واپس آتیں تو بچّے اُس وقت ریلوے اسٹیشن جاتے تھے اور پھر امّی کے ساتھ واپس آتے تھے۔

ایک دِن اُن کی امّی کی گاڑی آنے میں پورا ایک گھنٹہ باقی تھا۔ وہ ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ اِتنے میں ایک اور گاڑی آگئی۔ پیٹر باہر نِکلا تو دیکھا کہ

اُس کا انجن ڈرائیور وہ تھا جس نے اُس کا کھلونا ٹھیک کیا تھا۔ ۔ ۔ وہ اُس کو سلام کرنے گیا۔ اتنے میں پلیٹ فارم پر بھیڑ لگ گئی۔ پیٹر اور اُس کی بہنیں وہاں پہنچیں تو معلوم ہوا کہ ایک بیمار سا شخص اجنبی زبان میں بات کر رہا ہے۔ لوگ اِدھر اُدھر کھڑے سُن رہے ہیں، لیکن اُس کی بات کسی کے پلّے نہیں پڑ رہی ہے۔ لمبے لمبے بال، سوجی ہوئی آنکھیں، کانپتا ہوا بدن۔ پیٹر نے اسکول میں تھوڑی سی فرانسیسی سیکھی تھی، بس دو چار جُملے۔ اُس نے اس شخص سے پوچھا:

"پارلے وہ فرانسے" (یعنی کیا تُم فرانسیسی بول سکتے ہو؟)

اُس شخص نے اس کی بات کا فرانسیسی زبان میں جواب دیا، لیکن پیٹر اتنی فرانسیسی کہاں جانتا تھا کہ اُس کی بات سمجھ سکتا۔ اسٹیشن ماسٹر کا خیال تھا کہ پولیس کو بُلوا کر معلوم کیا جائے کہ یہ کون ہے۔ پیٹر نے بتایا کہ اُس کی ماں

فرانسیسی زبان جانتی ہے۔ وہ اگلی گاڑی سے آ رہی ہے۔ اتنے میں پیٹر نے اپنی جیب سے چند پُرانے ڈاک ٹکٹ نکالے۔ اُس کو ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا شوق تھا۔ کئی مُلکوں کے ٹکٹ اُس کے پاس تھے۔ اُس نے وہ اس شخص کو دِکھائے تو اُس نے ایک ٹکٹ چُن کر سر ہلایا۔ وہ ٹکٹ روس کا تھا۔ عین اُس وقت گاڑی آ گئی۔ پیٹر کی امّی آئیں تو اُنھوں نے اُس اجنبی سے فرانسیسی میں بات کی۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص روس کا ایک ادیب ہے۔ اس کا ریلوے ٹکٹ گُم ہو چکا ہے، وہ بیمار بھی ہے۔ پیٹر کی ماں نے کہا:

"اگر اسٹیشن ماسٹر اجازت دیں تو میں اِسے اپنے گھر لے جاتی ہوں، اِس سے معلومات کر کے کل آپ کو بتاؤں گی کہ اصل ماجرا کیا ہے۔"

اسٹیشن ماسٹر نے رضامندی ظاہر کی تو وہ اُس کو اپنے ساتھ لے گئیں۔

بچّے جلدی سے گھر پہنچے۔ اُنھوں نے آگ جلائی، کیوں کہ اجنبی سردی سے

کانپ رہا تھا۔ پھر پیٹر ڈاکٹر کو بُلانے گیا۔ ماں نے صندوق سے اُن کے ابّو

کے کُچھ کپڑے نکالے۔ اِس وقت بوبی کو خیال آیا کہ ہماری امّی ابّو کے

کپڑے دے رہی ہیں، کہیں ابّو مر تو نہیں گئے۔ اُس کی امّی نے کہا۔

"نہیں بیٹی، تمھارے ابّو ماشا اللہ خیریت سے ہیں۔ کسی دِن واپس آجائیں

گے۔ تُم ایسی باتیں نہ سوچا کرو۔"

رات کو اُن کی امّی نے اُنھیں بتایا کہ اِس شخص نے روس کے بادشاہ زار

کے زمانے میں ایک کتاب لکھی تھی، جس میں اس نے اِس بات پر زور دیا

تھا کہ امیر لوگوں کو غریبوں کی مدد کرنی چاہیے۔ زار کی حکومت نے پہلے تو

اُسے جیل میں ڈال دیا۔ پھر اُسے سائبیریا بھیج دیا جہاں اُس کو سخت تکلیفیں

دی گئیں۔

"وہ وہاں سے کیسے بچ نکلا؟" بچّوں نے پوچھا۔ اُن کی امّی نے بتایا کہ جنگ کے زمانے میں جو قیدی فوج میں بھرتی ہونا چاہتا، اُس کو سائبیریا سے نکال کر فوج میں بھیج دیا جاتا۔ فوج میں جا کر یہ بھگوڑا بن گیا۔ پھر اُسے معلوم ہوا کہ اُس کی بیوی بچّے انگلستان چلے گئے ہیں، اِس لیے وہ اُن کی تلاش میں لندن آ گیا۔ سفر کے دوران اُس کا ٹکٹ گُم ہو گیا اور وہ غَلطی سے اس اسٹیشن پر اُتر گیا۔

"امّی اُس کے بچّے مل جائیں گے؟" بچّوں نے پوچھا۔

امّی نے کہا۔ "اُمّید تو ہے۔ میری دُعا ہے کہ اُسے اُس کے بال بچّے مل جائیں۔ یہ بڑے دُکھ کی بات ہے۔ آج رات کی دُعا میں تم لوگ یہ دُعا بھی مانگو: "اے اللہ! تمام قیدیوں پر اور جو بال بچّے اپنے باپ سے بچھڑے ہوئے ہیں اُن پر رحم فرما۔"

ریل حادثے سے بچ گئی

روسی کی طبیعت کُچھ ٹھیک ہوئی تو وہ مکان کے باہر باغ میں بیٹھنے لگا۔ بچّوں کی امّی نے پارلیمنٹ کے ممبروں کو خط لکھ کر اپیل کی کہ وہ مُصیبت میں مُبتلااِس روسی کے بال بچّے تلاش کرنے میں مدد کریں۔

بچے نہ تو فرانسیسی جانتے تھے اور نہ روسی۔ وہ اِس روسی مہمان سے بات تو نہیں کر سکتے تھے، مگر یہ کرتے کہ پھول چُن لاتے اور مُسکرا کر اُس

اجنبی کو پیش کر دیتے۔ ایک دِن اُنھوں نے سوچا کہ پہاڑی سے چیریاں چُن کرلائی جائیں اور مہمان کو پیش کی جائیں۔ وہ پہاڑی پر گئے، دیکھا کہ ریل کی پٹڑی پر درخت اور ٹہنیاں گری ہوئی ہیں اور برابر گر رہی ہیں۔ شاید ایک چٹّان نیچے سِرک رہی تھی اور اُس کا ملبہ ریلوے لائن پر گر رہا تھا۔

پیٹر نے کہا۔ "اِس گاڑی کو حادثہ پیش آنے کا سخت خطرہ ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے کی گاڑی کا وقت ہونے والا ہے۔ جلدی سے اسٹیشن پر جا کر اطلاع دینی چاہیئے۔"

بوبی نے کہا۔ "وقت تو ہو چکا ہے، گاڑی کو حادثے سے بچانے کے لیے ہمیں کُچھ کرنا چاہیے۔ ہم اگر سُرخ رنگ کے جھنڈے لے کر پٹڑی کے پاس کھڑے ہو جائیں تو انجن ڈرائیور کو معلوم ہو جائے گا کہ آگے کوئی خطرہ ہے۔"

تینوں بچّوں نے اپنے کوٹ پھاڑ کر جھنڈیاں بنائیں اور ریلوے لائن پر کھڑے ہو گئے۔

دونوں بچّوں نے سُرخ کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اپنے کوٹ اُتارے، اُن کو پھاڑ کر چھے جھنڈے بنائے۔ پیٹر چھے ٹہنیاں لایا، جھنڈے اُن سے باندھ دیے گئے۔ تینوں بچّے دو دو جھنڈے لے کر

کھڑے ہو گئے۔ پھر ریل گاڑی کی آواز سُنائی دی۔ دُور سے سفید دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ بچّے جم کر کھڑے ہو گئے۔ بوبی بے تاب ہو کر گاڑی کی سمت جھنڈی لے کر بھاگی۔ پیٹر نے کہا۔ "بوبی پٹڑی سے دور رہو۔" ریل گاڑی قریب آتی گئی، یہ لوگ جھنڈے ہلاتے رہے۔ انجن ڈرائیور نے پہلے رفتار کم کی پھر بریک لگا کر گاڑی روک لی۔ بچّوں نے آگے بڑھ کر اُسے بتایا کہ پٹڑی پر چٹّان گری ہوئی ہے۔

بوبی پریشانی کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی۔ جب ڈرائیور کی تسلّی ہو گئی تو ریل اسٹیشن کو واپس گئی۔ رابرٹا کو گاڑی میں لِٹا دیا گیا۔ پیٹر اور فیلس اس کے ساتھ ہو لیے۔ تھوڑی دیر میں اُس کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ اسٹیشن پر پہنچ کر اسٹیشن ماسٹر کو بتایا گیا کہ اِن بچّوں نے ریل کو ایک حادثے سے بچا لیا۔ سب لوگوں نے اُن کی تعریف کی اور کہا۔ "یہ بچّے واقعی ہیرو ہیں۔"

بہادر بچّوں کے لیے انعام

رابرٹا کے دِل میں انسانی ہمدردی کُوٹ کُوٹ کر بھری تھی۔ وہ لوگوں کی مدد کر کے اُن میں خوشیاں بکھیرنا چاہتی تھی۔ وہ اتنی سمجھ دار تھی کہ اپنی ماں کے سامنے کوئی بات اپنی زبان پر نہ لائی۔ جس سے اس کی ماں کے غم میں اضافہ ہو۔ وہ اُس روسی کی مدد کرنا چاہتی تھی جو اپنے بچّوں کے لیے در در مارا پھرتا تھا۔

ریلوے والوں نے یہ فیصلہ کیا اِن بہادر بچّوں کو انعام دیا جائے۔ ایک مُختصر سی تقریب ہوئی۔ تینوں بچّوں کو ایک ایک گھڑی دی گئی۔ مہربان بُوڑھا بھی اِس تقریب میں شامل تھا۔ بوبی نے سوچا کہ اب موقع ہے، اُس سے روسی کے بارے میں بات کی جائے۔ تقریب کے خاتمے پر پیٹر نے چند جملے بولے۔ اُس نے کہا:

"ہم نے جو کُچھ کیا ہے اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے۔ ہم اس انعام کے لیے آپ سب کے شُکر گزار ہیں۔"

تقریب کے بعد بوبی نے مہربان بُوڑھے کو شپانسکی کی بیماری اور پریشانی کا حال سُنایا۔ شپانسکی اُس روسی کا نام تھا۔ نیک دِل بُوڑھے نے بتایا کہ وہ اِس ادیب کی ایک کتاب پڑھ چکا ہے۔ تمھاری امّی نے اس کی جو مدد کی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ میں بھی اِس کے بال بچّوں کو تلاش کرنے کی

کوشش کروں گا۔

مہربان بُوڑھا ریل کے بچّےاور روسی

اِس موقع پر اُس مہربان شخص نے تینوں بچّوں سے کئی سوال بھی پوچھے اور اُن کے حالات سے واقفیت حاصل کی۔

دس دِن بعد نیک دِل شخص اُن کے گھر آیا اور نے یہ خوش خبری سُنائی کہ شپانسکی کے بال بچّوں کو تلاش کر لیا گیا ہے۔ بچّوں کی امّی نے جب یہ خوش خبری سُنائی تو اُن کے چہرے پر خوشی کی چمک پھیل گئی۔ روسی تو یہ خبر سُن کر اُچھل پڑا۔ پھر وہ جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر سِسکیاں لینے لگا۔ بوبی نے یہ منظر دیکھا تو باہر چلی گئی۔ کُچھ دیر بعد آئی تو رحم دل بُوڑھے نے تینوں کو چاکلیٹ کا ایک ایک ڈبّا دیا۔

یہ نیک دِل اور شفیق بُوڑھا آدمی فرانسیسی بھی بول لیتا تھا۔ اُس نے روسی سے باتیں کیں۔ روسی نے اُن سب کا شکریہ ادا کیا اور ان سے اجازت چاہی۔ اُس کا سامان باندھ دیا گیا اور بچّے اُسے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا آئے۔

جب وہ گھر واپس آئے تو اُن کی امّی تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔ فیلس اُس

روسی کی بچّی کے بارے میں کہہ رہی تھی کہ اب وہ بڑی ہو چکی ہو گی اور پھر کہنے لگی : "امّی جب ابّو مُجھ ملیں تو اس وقت میں بھی بڑی ہو چکی ہوں گی۔"

اس وقت بوبی نے کہا۔ "چلو فیلس گیٹ تک دوڑ لگائیں۔" اصل میں بوبی نہیں چاہتی تھی کہ ابّو کے بارے میں بات کر کے امّی کی پریشانی میں اضافہ کیا جائے۔

درد ناک راز

ایک دِن اُن کی امّی کچُھ لکھ رہی تھیں، بوبی اُن کے لیے چائے لے آئی۔ امّی نے اُس سے کہا۔

”بوبی کیا بات ہے؟ تُم لوگ اب ابّو کی باتیں نہیں کرتے؟ کیا تُم اُنہیں بھُلا چکُے ہو؟“

بولی بولی: ”ہم اکیلے میں ابّو کو بہت یاد کرتے ہیں۔ آپ کے سامنے اِس

لیے نہیں کرتے کہ آپ کی پریشانی نہ بڑھے۔"

امّی نے کہا۔ "نہیں بولی نہیں۔" اور پھر اسے اپنے بازوؤں میں لے کر کہا :
"تمہارے ابّو اور مُجھ پر سخت آفت ٹوٹی ہوئی ہے، لیکن اِس سے بڑی آفت یہ ہوگی کہ تُم لوگ اُنہیں بھول جاؤ۔"

بوبی کی آواز بھرّا گئی۔ اُس نے کہا۔ "امّی میں نے عہد کیا تھا کہ آپ سے کوئی سوال پوچھ کر آپ کا دُکھ نہیں بڑھاؤں گی۔ امّی! کیا یہ تکلیف زیادہ دیر تک رہے گی؟"

اُن کی امّی نے کہا : "نہیں، جب تمہارے ابّو گھر آ جائیں گے تو یہ تکلیفیں ختم ہو جائیں گی۔"

"اچھّا اب مُجھے کُچھ کام کرنا ہے۔" امّی نے بوبی کو بھینچتے ہوئے کہا۔ "دیکھنا

بھائی بہن کو یہ نہ بتانا۔"

اگلے دِن بچّے باغبانی میں مصروف ہو گئے۔ پیٹر ایک بیلچے پر پاؤں رکھ رہا تھا کہ گِر پڑا۔ اس کے پاؤں پر چوٹ لگی اور وہ آرام کرنے گھر چلا گیا۔ بوبی اخبار لینے اسٹیشن چلی گئی۔ اس نے قُلی سے کہا۔ "اگر مسافروں نے کوئی اخبار یا رسالے چھوڑے ہوں تو ہمیں پڑھنے کے لیے دے دیجئے۔" پرکس قُلی نے چند پرچے ایک پُرانے اخبار میں لپیٹے اور بوبی کو دے دیے۔ بوبی جب ریلوے کراسنگ پر آئی تو گاڑی آ رہی تھی۔ اُس نے پارسل گیٹ پر رکھا اور گاڑی کے گُزر جانے کا انتظار کرنے لگی۔ اچانک ایک خبر پر اُس کی نظر پڑی۔ اس کا دِل دھڑکنے لگا۔ اُس نے پارسل کو اُٹھایا اور گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اُس خبر نے اُس کے دِل میں آگ بھڑکا دی تھی۔ وہ سخت پریشان تھی۔ نہ جانے اِس حال میں وہ گھر کیسے پہنچی۔ گھر پہنچتے ہی

اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔ پارسل کھول کر وہی اخبار نکالا۔

اُس خبر کا عنوان تھا :

"مقدمے کا فیصلہ سُنا دیا گیا۔ مجرم قصوروار پایا گیا۔ اُس کو پانچ سال قید کی سزا سُنائی گئی۔"

بوبی نے پارسل گیٹ پر رکھا، اس پارسل میں وہ اخبار تھا جس میں چھپی خبر پڑھ کر اُس کا دِل دھڑکنے لگا۔

"ہائے میرے ابّو! یہ سب جھوٹ ہے۔ میرے ابّو ایسے آدمی نہیں۔ وہ ایسا کام کر ہی نہیں سکتے۔ یہ غَلَط ہے، غَلَط ہے، غَلَط ہے۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ فیلس نے کہا۔ "چائے تیّار ہے۔ بوبی نے سر درد کا بہانہ کر کے بد دِلی سے جلدی جلدی چائے پی اور اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ وہاں کھڑے کھڑے وہ یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اپنی امّی سے کیا کہے۔ پھر وہ بڑے درد سے اپنی امّی کا نام بار بار پکارنے لگی اور بِلک بِلک کر رونے لگی۔ اُس کی امّی نے اُسے گلے سے لگا لیا اور اسے چمکارتی رہیں۔ پھر بوبی نے اخبار کا ٹکڑا نکالا اور ابّو کے نام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امّی کی طرف بڑھا دیا۔

امّی نے کہا: "بوبی کیا تمہارے ابّو ایسا کر سکتے ہیں۔"

بوبی بولی۔ "نہیں ہرگز نہیں۔"

امّی اُس سے کہنے لگیں : ”اُنھوں نے اُنھیں جیل میں ڈال دیا ہے ، لیکن تمہارے ابّو بے قصور ہیں ، بالکل بے قصور۔“

”امّی آپ نے مُجھے بتایا کیوں نہیں ؟“ بوبی نے پوچھا۔

”کیوں ؟“

”کیوں کہ ۔ ۔ ۔“ بوبی یہ کہہ کر رُک گئی۔

”یہی بات تھی جس کی وجہ سے میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا۔ اب تمہیں اور مُجھے بڑی ہمّت سے ، بڑے حوصلے سے یہ سب کُچھ برداشت کرنا ہے۔“ امّی نے بوبی کو سمجھایا۔

پھر اُس کی امّی نے اُسے بتایا کہ اُس رات سفید کپڑوں میں دو پولیس والے آئے تھے اور آپ کے ابّو کو اِس جُرم میں گرفتار کر کے لے گئے تھے کہ

کوئی سرکاری راز روس کو بیچا ہے۔ آپ کے ابّو کی میز کی دراز سے کُچھ ایسے خط ملے تھے جِن سے یہ شک پیدا ہوا۔ آپ کے ابّو نے بتایا تھا کہ اُن کا ایک ماتحت اُنہیں نکلوا کر اُن کی جگہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ خط اُس نے وہاں رکھے تھے، مگر اِس بات کو عدالت میں ثابت نہیں کیا جا سکا کہ یہ خط اُس نے رکھے تھے۔"

امّی! کیا ہم کسی اور شخص کو یہ ساری باتیں بتا کر مدد حاصل نہیں کر سکتے؟" بوبی نے پوچھا۔

"میں نے ہر کوشش کر دیکھی ہے۔ کوئی نہیں سُنتا۔" اس کی امّی نے جواب دیا۔

ایک ہفتے کے بعد بوبی نے اُس نیک دِل بُوڑھے انسان کو ایک خط لکھا اور سارا واقعہ لکھ بھیجا اور اخبار کا تراشا بھی اُس کے ساتھ لگا دیا۔ بوبی نے لکھا:

"اے مہربان بزرگ، آپ ہماری پریشانی کا اُسی وقت صحیح اندازہ کر سکیں گے جب آپ اس بات کو اُس نظر سے دیکھیں کہ اگر آپ کے باپ کے ساتھ ایسا واقعہ ہوتا تو آپ پر کیا گُزرتی۔ مُجھے یقین ہے کہ آپ ہماری پوری مدد کریں گے۔"

اگلے دِن گرامر اسکول کے بچّے اُن کے گھر کے پاس "خرگوش کے تعاقب" کا کھیل کھیلنے آئے۔ ایک لڑکا خرگوش بنا۔ دوسرے اس کا پیچھا کرنے والے کُتّے بنے۔ یہ تینوں بچّے اُن کا کھیل دیکھنے ایک اُونچی جگہ جا کھڑے ہوئے۔ ایک بڑا لڑکا جو خرگوش بنا تھا کاغذ کے پرزے گراتا ہوا بھاگا چلا جاتا تھا۔ پھر وہ سُرنگ میں داخل ہوگیا۔ جو لڑکے کُتّے بنے تھے وہ کاغذ کے پُرزوں کو دیکھ کر اُس کے پیچھے پیچھے بھاگے چلے جارہے تھے۔ اُن میں سے آخری لڑکے نے سُرخ جرسی پہن رکھی تھی۔ خاصی دیر کے

بعد ہانپتا ہوا خرگوش سُرنگ سے نکلا۔ اُس کے بعد پیچھا کرنے والے نکلے،

مگر سُرخ جرسی والا لڑکا نہ نکلا۔

"خرگوش کے تعاقب" کے کھیل میں بچّے سُرنگ میں داخل ہو رہے ہیں۔

پیٹر نے کہا۔ "سُرخ جرسی والا لڑکا ابھی تک نہیں نکلا۔"

بوبی بولی۔ "ہاں وہ نہیں نکلا۔"

اُنھوں نے کُچھ دیر انتظار کیا۔ پھر پریشان ہو گئے کہ ضرور اسے کُچھ ہو گیا ہے ورنہ اتنی دیر وہ نہ لگاتا۔

"چلو اُس کو تلاش کریں۔ اگر وہ کسی تکلیف میں ہے تو اس کی مدد کریں۔"

وہ پہاڑی سے نیچے اُتر کر پٹڑی پر آئے۔ پھر سُرنگ کی طرف بڑھے اور سُرنگ میں داخل ہو گئے۔ سُرنگ کی سبز اینٹوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے اندھیرا چھانے لگا۔ اتّفاق سے پیٹر کی جیب میں موم بتّی تھی اُس نے موم بتّی جلائی۔ اتنے میں پٹڑی سے آواز آنے لگی۔ "یہ گاڑی ہو گی۔" بوبی نے کہا۔ سُرنگ کی

دیواروں میں کھڑے ہونے کے لیے محرابیں بنی ہوئیں تھی۔ بوبی نے پیٹر اور فیلس دونوں کوایک محراب میں دھکیل دیااور خود بھی وہیں کھڑی ہو گئی۔

گاڑی سُرنگ میں داخل ہو چکی تھی۔ شور بڑھ گیا تھا۔ دھوئیں کی بُو آ رہی تھی۔ فیلس نے کہا۔ "سُرخ جرسی والالڑکا اگر پٹڑی پر تو۔۔۔؟"

پیٹر نے کہا۔ "اب انجن کی روشنی ہو رہی ہے ذرا دیکھو۔" بچّوں نے دیکھا کہ کُچھ دور سُرخ جرسی والا لڑکا دیوار کے ساتھ لگا ہوا پڑا ہے۔ دیکھا تو وہ بے ہوش تھا۔ فیلس نے اُس لڑکے کی بوتل کھولی۔ اُس میں دودھ تھا۔ اُس نے اس کی پیشانی پر دُودھ کے چھینٹے مارے۔ بوبی اُس سے کہنے لگی :

"دیکھیے ہم آپ کی مدد کو آئے ہیں۔ آنکھیں کھولیے۔ "بولیے۔"

سُرخ جرسی والا

کُچھ دیر بعد اُس لڑکے نے آنکھیں کھولیں۔ اُنھوں نے اُسے دُودھ پیش کیا اور کہا :

گھبرائیے نہیں، ہم آپ کی مدد کرنے آئے ہیں۔"

وہ لڑکا بتانے لگا کہ اِن تاروں میں اُلجھ کر گِر پڑا تھا۔ شاید اُس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ اُس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

پیٹر اور فیلس سُرنگ سے باہر اُس جگہ گئے جہاں سگنل لگا ہوا تھا۔ وہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی آدمی رہا کرتا تھا۔ اُس سے مدد طلب کی جا سکتی تھی۔ بوبی نے لڑکے کے جوتوں کے تسمے کھولے تاکہ اُس کی ٹانگ کو کُچھ آرام ملے۔ وہ اُس کا حوصلہ بڑھاتی رہی۔ اتنے میں پیٹر اور فیلس کے ساتھ ایک آدمی اُس کی مدد کے لیے آ گیا۔ سُرخ جرسی والے لڑکے کو تین چمنیوں والے مکان میں لے جایا گیا جو اُن تینوں بچّوں کا گھر تھا۔

بچّوں نے اپنی ماں سے کہا کہ ٹھیک ہونے تک اُسے گھر میں ہمارے ساتھ رہنے دیا جائے۔ معلوم ہوا کہ اُس لڑکے کی ماں مر چُکی ہے۔ وہ اپنے دادا کے ساتھ رہتا ہے۔ اُس کے اسکول میں چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ امّی نے کہا۔ "ہم اِس کے دادا جان سے اجازت لے کر اِسے چند دِن اپنے پاس رکھ لیں گے۔"

کیا آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُس کے دادا کون تھے ؟

اُس کے دادا وہی نیک دِل اور مہربان آدمی تھے جو اُن بچّوں کی مدد کرتے تھے ۔ جب اُس کے دادا جان سے اجازت مانگی گئی کہ جم کو "تین چمنیوں" میں کُچھ دِن آرام کرنے دیا جائے تو اُنھوں نے سوچا کہ یہ لوگ خود تکلیف میں ہیں ۔ اتنا خرچ اُن کے بس کی بات نہیں ۔ اس لیے انھوں نے بہت سی کھانے کی چیزیں اور دو ملازم بھجوا دیے ۔

سُرخ جوسی والے لڑکے کا نام جم تھا ۔ جلدی ہی پیٹر اور وہ دوست بن گئے ۔ جم رابرٹا کی ہمدردی کو نہیں بھولا تھا ۔ وہ کہتا تھا کہ رابرٹا ایک بہادر لڑکی ہے ۔

جسم کے دادا جان اُسے دیکھنے آئے ۔ اُنھوں نے رابرٹا کو بتایا کہ تمھارا خط مُجھے مل چکا ہے ۔ خط سے پہلے ہی اخبار میں اُس مقدمے کا حال پڑھ چکا تھا

کہ دال میں کُچھ کالا ہے۔ میں اصل بات معلوم کر رہا ہوں۔ تُم اِس راز کو کُچھ دِن اور اپنے تک رکھو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بات سُن کر بوبی کا چہرہ کندن کی طرح چمکنے لگا۔

جم کو جو جو اچھّی باتیں معلوم تھیں وہ اُس نے پیٹر کو بتائیں۔ اُس کی ٹانگ پہلے سے بہتر ہو گئی۔ "تین چمنیاں" میں رہ کر وہ بہت خوش تھا۔ یہ تین بچّے بھی اب ریل کے بچّے نہیں رہے تھے۔ اب وہ گھر پر ہی رہتے تھے۔ صرف ایک گاڑی جو لندن جاتی تھی اس کے لیے روز جاتے کیوں کہ وہ اپنے خیال کے مطابق اُس کے ذریعہ سے اپنے ابّو کو محبّت کا سلام پہنچاتے۔

ایک دِن بوبی نے کہا۔ "کاش کوئی حیرت انگیز بات ہو جائے۔" چار دِن بعد وہ حیرت انگیز بات ہو گئی۔ ستمبر کا مہینہ تھا۔ ڈھلان کی گھاس سوکھ چکی

تھی۔ سوا نو بجے کی گاڑی کے لیے وہ تیّار ہوئے۔ سلیپر پہنے، رومال
نکالے تاکہ ہلا ہلا کر گاڑی والوں کو سلام کریں۔ گاڑی آئی تو گاڑی آئی تو
آج بات ہی کُچھ اور تھی، ہر چیز بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔

آج بات ہی کُچھ اور تھی۔ نیک دِل بُوڑھے نے زیادہ زور سے ہاتھ ہلایا۔
گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اپنے اپنے ہاتھ ہلائے۔ وہ خوش خوش
نظر آرہے تھے۔ گاڑی سن سے گزر گئی۔ بچّے ہکّا بکّا رہ گئے۔ منظر کیوں
بدلا ہوا ہے۔

اس وقت سے لے کر اگلی صُبح تک بوبی کے دِل اور دماغ پر کُچھ کشمکش ہی
رہی۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ وہ اپنے دُکھ کو چھپائے کھوئی کھوئی سی رہتی تھی
اور اب یہ فکر ہے کہ نہ جانے کیا ہوگا۔ اُس نے سوچا شاید ریلوے اسٹیشن
سے کُچھ معلوم ہو جائے۔ وہ اُدھر چلی۔ آج پہلی بار راستے میں کئی

دیہاتیوں نے اُسے سلام کیا۔ ڈاک خانے والی خاتون وہاں آئی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے تو پیار سے بوبی کو گلے سے لگایا۔ اسٹیشن کے مستری نے اُسے دُعا دی اور خود اسٹیشن ماسٹر صاحب بڑی شفقت سے ملے اور کہا :

"گیارہ بج کر چوّن منٹ والی گاڑی کُچھ دیر سے آئے گی۔"

گاڑی آئی تو آج بات ہی کچھ اور تھی، ہر چیز بدلی بدلی سی لگ رہی تھی

اور تو اور ریلوے اسٹیشن کی بِلّی کی میاؤں بھی آج کُچھ اور انداز کی تھی۔ وہ اُس کے پیروں میں آ کر اُس کے موزوں سے اپنی پیٹھ سہلانے لگی۔ پھر قُلی پر کس بِلا اور خندہ پیشانی سے پیش آیا۔

"کیا یہ بات پوچھنے کی ہے یا نہیں؟" بوبی یہ سوچ رہی تھی کہ گیارہ بج کر چوّن منٹ والی گاڑی اسٹیشن پر آ گئی۔ اُس میں سے صرف تین آدمی اُترے۔ ایک دیہاتی عورت چوزے لیے ہوئے، ایک پارسل اُٹھائے اور ایک اور شخص۔۔۔

اتنے میں ایک زبردست چیخ فضا میں بُلند ہوئی جو گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے دِلوں میں نِشتر کی طرح اُتر گئی۔ دُنیا سہم گئی۔

"میرے ابّو، میرے ابّو، میرے ابّو!" لوگوں نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی لڑکی دیوانہ وار اپنے باپ سے لپٹی ہوئی ہے۔ اُس نے دونوں بازوؤں

سے اپنے باپ کی ٹانگوں کو جکڑ رکھا ہے۔

باپ بیٹی گھر کو چلے۔ راستے میں ابّو نے اُسے بتایا کہ پولیس نے اُس آدمی کو پکڑ لیا ہے جس نے مُجھے پھنسانے کے لیے وہ خط میری میز میں رکھے تھے۔ اور اب سب کو معلوم ہو چکا ہے کہ تمہارے ابّو نے کوئی جُرم نہیں کیا۔

ختم شُد